بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(یہ تحریر جس اخلاص اور دردمندی سے لکھی گئی ہے ۔کاش کہ اسی
طرح کے ذہن سے اسے پڑھا جائے) (ن ۔ ص)

آپ اگر کسی جزیرے میں رہتے ہوں اور زبردست طوفان یکایک اٹھے جو سمندر کے پانی کو خشکی پر چڑھا لائے ، یہاں تک کہ پانی کا بیس تیس فٹ اونچا ریلا آپ کی بستی کی طرف بڑھنے لگے تو کیا ایسی خوفناک گھڑی میں آپ میکدوں میں ساغر اچھالیں گے، کلبوں میں ڈانس کا انتظام کریں گے ، کوٹھے کی چھت پر قمار بازی کے لیے پالا جمائیں گے ۔ اور خفیہ برآمد کے لیے ہیروئن کی پیکنگ کریں گے ؟

اگر خدانخواستہ آپ کے محلے میں آگ بھڑک اٹھے اور خود آپ کے بھی مکان کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے تو کیا ایسے میں آپ اپنے صحن میں سیاسی تصادم یا فرقہ وارانہ جھگڑوں کا دنگل جمانا مناسب سمجھیں گے ؟

اگر بستی میں مسلح ڈاکو باچھاپہ مار گھس آئیں اور فائر کر کر کے مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے ہوں اور وہ ایسی لوٹ مچائیں کہ چاروں طرف دہشت چھا رہی ہو تو کیا آپ یہ مناسب خیال فرمائیں گے دوڑنے بھاگنے والوں کی جیبیں رشوت کی قینچی سے کاٹی جائیں؟

کشتی اگر بھنور میں گھر کر ہچکولے کھانے لگے تو کیا موقع کے لحاظ سے صحیح رویہ یہ ہو گا کہ آپ ریڈیو یا ٹیلی وژن سے موسیقی کی دھنیں چھیڑ کر سر دھننے لگیں ؟

خدانخواستہ آپ کے کارخانے کو آپ کے دشمنوں کا ایک جتھا آکر گھیرے تو کیا یہ

قابلِ تصور رہے کہ آپ کے کارخانے کے اندر صوبائی تعصب کے جذبوں سے افسر اور کارکن ایک دوسرے کو ہلاک کرنے میں لگ جائیں؟

آپ برقائمیٔ ہوش و حواس متذکرہ صورتوں میں سے کسی کو بھی درست قرار نہیں دیں گے۔

اب ذرا اشاروں اور مثالوں کا پردہ ہٹا کر اپنی قومی و ملکی زندگی کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیجیے۔

ہمارے شمال مغربی جانب ایک سپرپاور نے ہماری ایک برادر مُسلم قوم کی آزادی پر اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں، لیکن عوام اس درندگی کے خلاف فوجی نظم، مؤثر اسلحہ اور رسد و مدد سے محروم ہونے کے باوجود معرکہ آرائی کا ایک ولولہ انگیز اور عبرت ناک باب تاریخِ انسانیت میں اپنے لہو کی روشنائی سے لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کے ملبے اور اپنے باغوں اور فصلوں کی راکھ اور اپنی خون میں نہائی ہوئی لاشوں سے بارود، آگ اور زہریلی گیسوں کے سیلاب کے سامنے اب تک ناقابلِ شکست بند باندھے ہوئے ہیں۔ سُرخ سپرپاور کی پوری تاریخِ استعمار میں پہلا موقع آیا ہے کہ ایک چھوٹی سی نہتی قوم نے چار سالہ مقاومت میں اسے ناکوں چنے ہی نہیں چبوا دیے، چٹانیں چبوا دی ہیں۔

مگر ہماری سرحد کے اُس طرف جو جہاد برپا ہے اور جو خون خرابہ ہو رہا ہے اُسے ہم نے نہ سنجیدگی سے غور کا مستحق سمجھا اور نہ اُس کے ممکناتِ مابعد کا کوئی تصور باندھا۔ ہم نے صرف افغانستان کے بلاکشوں کے کنبوں کو پاکستان میں پناہ دے کر (اور کبھی کچھ امدادی چندے اور کپڑے اور دوائیں دے کر) یہ سمجھ لیا کہ بس حکومت اور عوام پر جو فرض عاید ہوتا تھا وہ ادا ہو گیا۔ اِس میں بھی کچھ اختلافی سوچ رکھنے والوں اور کچھ بدگمانیوں نے یہ بات نکال لی کہ مہاجرین بڑے خوش حال لوگ ہیں اور یہاں رہنے کے مستحق بھی نہیں ہیں اور اُن کو رکھنے کی وجہ سے ہم رُوس کی ناراضگی کا ہدف بن سکتے ہیں۔ گویا اگر مہاجرین کو نکال دیا

جائے اور افغانستان پر روسی تسلط کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان کو کوئی خطرہ نہیں۔ حالانکہ افغانستان روسی فتح کا پہلا پڑاؤ ہے۔ جہاں سے ایک طرف پاکستان کی جانب اور دوسری طرف پٹرولی ممالک کی جانب سارا فاصلہ دو قدم کا ہے۔ یہ دو قدم آج نہ طے ہوئے تو دو چار سال بعد سہی!

مختصر یہ کہ ایک استعماری سپر پاور ہمارے سر پر آپہنچی ہے اور پے در پے ہمارے علاقوں پر بمباری کر کے وہ انتباہ دے رہی ہے کہ ہمارا ساتھ دو اور ہماری پالیسیوں کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ، ورنہ افغانستان کی طرح تمہارے خلاف بھی جارحیت ہو سکتی ہے جس کے دو دو ہاتھ ہم نے دکھا دیئے ہیں۔

یعنی ایک حویلی میں لُٹس مچانے والا حملہ آور کہہ رہا ہے کہ ہمارے خلاف آواز نہ اُٹھاؤ، اس حویلی سے جان بچا کر نکلنے والوں کو پناہ نہ دو، ورنہ تمہاری حویلی کی بھی خیر نہیں اور اگر شور نہ کریں اور کسی کو پناہ نہ دیں تو بھی جس دستور و اخلاق کے تحت برابر والی حویلی لُٹ رہی ہے وہی دستور و اخلاق ایک دن ہمیں بھی نشانہ بنائے گا۔

خیر تو اِدھر کی سرحد پر کھلے حملے ہو چکے ہیں، اور ساتھ کے ساتھ ہمارے معاشرے کے اندر بھی پروپیگنڈے اور افواہوں اور نظریاتی محاذ پر بھی ہمارے خلاف کام ہو رہا ہے نیز تربیت یافتہ تخریب کار بھی یہاں داخل ہو چکے ہیں جن کی سرگرمیوں سے دو نتیجے مطلوب ہیں: ایک یہ کہ خود مہاجرین کے خلاف نفرت پھیلے کہ چونکہ افغانستان سے آنے والے ہی ہنگامے اُٹھا رہے ہیں، لہٰذا وہاں سے آمدہ تمام لوگ ناقابلِ اعتماد ہیں۔ دوسرے یہ کہ عام لوگوں میں دہشت پھیلے اور ان کا اضطراب حکومت کو مجبور کر دے کہ وہ رُوس کے پاؤں پکڑ کر نجات کی کوئی صورت پیدا کرے۔

مزید برآں، ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ ہونے والے انتخابات میں حامیانِ رُوس کی پروپیگنڈا مشینری بھی اپنا کام زور و شور سے کرے اور ایسے افراد بھی اقتدار تک پہنچنے کے لیے کوئی خوشنما نقاب چہرے پر ڈال کر انتخابی کشمکش میں شریک ہو جائیں۔

اب لیجیے جنوبی اور جنوب مشرقی سرحد کو، اس سرحد پہ جھڑپیں بڑھ گئی ہیں۔ لداخ کی جانب سرحد کے آخری حصے میں بھارتی فوج نے ایک زوردار حملہ کیا اور کشمیر کی کنٹرول لائن کو توڑ کر پاکستانی علاقے میں واقع گلیشیئر کے بہت بڑے رقبے پر قبضہ جما لیا ہے — تازہ خبروں کے مطابق چین کی جانب کا مزید رقبہ بھارت کے پاس چلا گیا ہے۔ اس مقام سے شاہ راہ ریشم بھارت کی زد میں آجاتی ہے، جب کہ اس کے سرپرست حلیف روس نے شاہ راہ کی دوسری جانب واخان کی پٹی پہ قابو پا لیا ہے۔ چین پاکستان رابطے کی شاہ رگ کے دونوں جانب نشترِ زہر آگیں رکھے ہیں۔

اِدھر بھارت کی فوج بھاری تعداد میں پاکستانی سرحد کی ملحقہ چھاؤنیوں میں آچکی ہے اور خط سرحد کے قریب بھی ان کی نقل و حرکت ہوتی رہتی ہے۔ آج کی یہ خبر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بھارت نے مگ ۲۳ نامی لڑاکا بمبار طیاروں کو پاکستان سے ملحقہ اڈوں پر منتقل کر دیا ہے اور ۶۰ طیاروں پہ مشتمل دو اسکواڈرن جودھپور کے ایڈوانس بیس پر رکھے گئے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے تمام اہم مقامات کو زد میں لینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ روس سے جدید مہلک ترین اسلحہ کے انبار کے انبار قسط در قسط چلے آرہے ہیں۔ بھارت کی اپنی فیکٹریاں بھی اور بھاری اسلحہ کے انبار لگا رہی ہیں۔ ہماری ایٹمی تجربہ گاہ جو کہوٹہ میں ہے، اس پہ اسرائیل کے اشتراک سے بھارت کی طرف سے ناگہانی حملہ کرنے کا اعلانِ عام سامنے آچکا ہے۔ سندھ میں بھارت مقامی ہندو آبادی اور سیکولرسٹ دانشوروں کے ذریعے پاکستان کے خلاف اپنا لٹریچر اور پروپیگنڈا پھیلا رہا ہے اور آدمی گھسا رہا ہے[1]۔ جس کے زیرِ اثر نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ایک تعلیمی مرکز میں پاکستان کا جھنڈا لگانے والوں کے

---

[1] مبینہ طور پہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری سندھی یونیورسٹیوں میں بھارت سے جعل سازیاں کر کے ہندو نوجوان آتے ہیں اور ہمارے خرچ پہ ڈاکٹری اور دوسرے علوم کی تحصیل کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ نئے آتے رہتے ہیں۔ سندھ کی ہندو آبادی کے لیے کوئی نظم یا کنٹرول اور ضروری ریکارڈ کے ہونے نہ ہونے کا ہمیں علم نہیں۔

خلاف مخالفین نے خون ریز بلوئی کیا اور جھنڈا انہیں لگ سکا۔ کچھ حادثے ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ اسکیم یہ ہے کہ سندھ کو بھارت خراب کرے اور بلوچستان میں روس نقب لگائے اور وقت آنے پر پنجاب کو ایک طرف رکھ کر سندھ اور بلوچستان کو الگ کاٹ لیا جائے۔ اس پروگرام کے لیے پیدل فوج، ٹینکوں اور آرمرڈ کاریوں توپ خانوں، فضائی اور بحری قوت میں تیزی سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔

ان فوجی سرگرمیوں کے پیچھے اندرا گاندھی[1] کا ذہن اس طرح کام کر رہا ہے کہ بھارت کے مختلف علاقوں میں جو مخالفانہ سیاسی طوفان اُمڈ رہا ہے اُس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے ہندو سلطنت کی نگاہوں میں پاکستان کو ہوّا بنا دیا جائے اور موقع ملتے ہی کوئی جنگی اقدام کر ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں شور برپا ہے کہ پاکستان نے بہت اسلحہ جمع کر لیا ہے اور یہ بھارت کے خلاف استعمال ہونے ہی والا ہے۔ پاکستان کی طرف سے یہ آخری چارۂ کار تھا کہ اُس نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی پیش کش کر دی۔ مگر بھارتی ڈپلومیسی نے اس پیش کش کو اپنے پروپیگنڈے کی گرد میں بالکل دفن کر دیا۔ اب بھارت کے اندرونی پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ مغرب میں عالمی سطح پر پاکستان کے مسلح ہونے کے خلاف اور جوہری توانائی پر کام کرنے کے خلاف پے در پے طوفان اُٹھائے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ڈپلومیٹک حلقوں میں اسرائیلی ماہرین کے تعاون سے پاکستان کے لیے ایڈ اور اسلحہ کی ترسیل کو رکوانے کے لیے کسی قدر ظاہراً اور زیادہ تر باطناً پُرزور کام کیا جا رہا ہے۔

اِس طوفانِ برق و باراں میں گھرے ہوئے ہمارے قافلۂ قوم کے احوال و مشاغل پر بھی چھچلتی نظر ڈال لیجیے۔

جرائم کا یہ حال کہ مسلح افراد دن دہاڑے بڑے بڑے شہروں کے پُررونق علاقوں میں بنکوں اور جوہریوں کی دکانیں لوٹ کر با آرام گاڑیوں پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ شاہراہوں پر ٹرکوں

---

[1] اشارات کی کتابت مکمل ہونے کے بعد پریس کو بھیجتے ہوئے یہ اطلاع ملی کہ اندرا گاندھی پر قاتلانہ حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ہندو قوم اور اندرا گاندھی کے خاندان کو جو صدمہ پہنچا ہے اس پر ہم اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔ (ادارہ)

بسوں اور کاروں کو ڈاکوؤں کی ٹولیاں آئے دن لوٹتی رہتی ہیں۔ کہیں عورتوں کے کپڑے نوچ کر ان کو بازاروں میں ننگے پھرایا جاتا ہے اور کہیں خواتین کے ناموس کبھی گھروں میں گھس کر، کبھی تھانوں اور حوالاتوں میں اور کبھی کسی ڈاکٹر کے کلینک یا آپریشن تھیٹر میں لوٹ لیے جاتے ہیں۔ ایک تازہ اخباری رپورٹ کے مطابق جیل جانے والے نوجوان مجرموں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ جرم کی شیطانی قوت نے انسدادِ جرم کے مراکز میں آشیانے بنا لیے ہیں۔ کتنے ہی پولیس کارکنوں کے خلاف پچھلے دنوں کارروائیاں کی جا چکی ہیں اور ان سے کہیں زیادہ ایسے بھی ہوں گے جو گرفت میں نہیں آسکے۔ پولیس میں کوئی رپورٹ درج کرانے جائے یا تفتیش کے لیے کسی کو گرفتار کر کے لے جایا جائے، بالعموم سب نذرانہ پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں[1]۔ باقی رہا ناشائستہ سلوک سو وہ "خدمتِ عام" ہے۔ خلیجی ممالک میں جانے کے حریص افراد سے چالاک لوگ روپیہ اینٹھ کر ان کو جعلی پاسپورٹ اور ویزے فراہم کرتے ہیں جس کے تلخ نتائج اندھے طالبانِ دولت کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ کالجوں اور درس گاہوں میں یونینوں پر پابندی کے بعد بھی غنڈہ گردی ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خرابی کا اصل سبب یونینز نہیں تھیں۔ نشیات کی برآمد اور تعیشات کی ناجائز طریقوں سے درآمد بڑھ رہی ہے۔ جعلی مہروں کے ساتھ مصنوعات اور ان کے پرزے دستیاب ہیں اور وہ مارکیٹ میں اس طرح گڈمڈ ہیں کہ کسی عام خریدار کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اصل کونسی ہے اور نقل کونسی۔ نوجوانوں میں نشہ بازی (خصوصاً ہیروئن سے لذت اندوزی) کی وبا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف سے شراب بندی کی کوشش ہے تو شیطان نے دوسری طرف ایک نیا راستہ کھول دیا ہے جس پر گرفت کرنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔

بسوں اور ویگنوں نے الگ اپنی مصیبتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ بوریوں کی طرح آدمیوں کا

---

[1] کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ مبینہ طور پر پولیس نے گلیوں میں گھس گھس کر بہت سے بے گناہ شہریوں کو پکڑ لیا ہے اور ان سے سودے کر کر کے ان کو چھوڑا جاتا ہے۔

اندر گھسنا اور بندروں کی طرح لٹکنا ایک طرف، ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کی بدسلوکیاں دوسری طرف، ٹیپوں سے واہیات گانے سنوانے کی شامت تیسری طرف، اور حادثات کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی بذریعہ قتل چوتھی طرف۔

یہ ہے حال اس قوم کا جس کے لیے جلتے کہاں کہاں چھریاں تیز ہو رہی ہیں۔

پستی کا ایک پہلو یہ ہے کہ شہروں میں بازار گردی، آوارہ خرامی، تفریحی پارکوں میں بدتمیزی کی رو بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ شور و غوغا بھرت، بدنظمی اور بے ترتیبی عام، بسوں اور ویگنوں میں سفلہ پن کے تماشے معمول، اور غلاظت اور کوڑا سڑک سڑک اور گلی گلی کی زینت ہے۔ کہیں گٹر اُبل رہے ہیں اور کہیں سر عام گلیوں کو گھر کا بیت الخلا سمجھ کر تہذیب و شائستگی کو پیشاب سے نہلایا جا رہا ہے۔

نئے دور کے "ٹیلی وژن زدہ" بچے گلی گلی ہاکی اور کرکٹ کی گراؤنڈیں بناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شور شرابے اور گالم گلوچ اور ضرورت پڑے تو آپس میں مار دھاڑ کا ڈرامہ بھی کر لیتے ہیں۔ کبھی کرکٹ کی گیند کسی کا کلا پھوڑتی ہے، کبھی کسی کی عینک توڑتی ہے اور کبھی کسی گاڑی کا شیشہ کرچی ہو جاتا ہے۔ پتنگ بازی کا زمانہ ہو تو پھر بانسوں پہ بندھے جھاڑ جھنکار ہاتھوں میں لیے اور نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھائے یہ بچے سڑکوں پہ ٹریفک کے لیے آفت بنتے ہیں۔ اور گلیوں میں راہگیروں سے ٹکراتے ہیں۔ چھتوں پہ ہوں تو پردے کا لحاظ اور نہ کسی کی گھریلو پرائیویسی محفوظ!

یہی بچے دس بارہ سال کی عمر میں کہیں کاریں اور کہیں سکوٹر اس حال میں جھگاتے نظر آتے ہیں کہ کبھی کبھی سکوٹروں پہ چار چار سواریاں لدی ہوتی ہیں، جن میں ایک آدھ ایستادہ بھی ہوتی ہے۔ کہیں درختوں پہ لٹک لٹک کر ان کی ٹہنیاں توڑتے ہیں، کہیں پبلک مقامات سے یا دوسروں کے بیرونی پائیں باغوں سے پھول نوڑتے ہیں۔ کہیں سڑکوں اور دیواروں پہ چاک یا کوئلے سے لٹریچر یا مصوری کے شاہکار ثبت کرتے ہیں۔ کوئی گاڑی کھڑی دیکھی تو اسے چھیڑنے لگے، کسی کا سائیکل ہتھے چڑھا تو اس کو انجینیری کا نشانہ بنا لیا۔ دن کا پچھلا پہر بیرونِ خانہ کے کھیل کود میں بسر کیا۔ اور شام کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے ٹیلی وژن کے سامنے

نا تو بڑے ادب سے تہ کر لیا۔ ان کی حرکات و مشاغل کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے ماں باپ بھی ہیں۔ اور کبھی کسی نے ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی ہے اور انھیں کوئی نصیحت یا ادب کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ "ٹیلی وژن زدہ" بچوں کے سامنے ماں باپ کی چلتی ہی نہیں۔ وہ بیچارے دم سادھے نئی نسل کی ترقیات کو دیکھتے رہتے ہیں، بلکہ اکثر ان کی بے راہ روی پر خوش بھی ہوتے ہیں۔ میں نے تو ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں کہ تین تین برس کے بچوں کو نرسری اسکولوں میں پھینک کر ماں اور باپ اس طرح بھاگتے ہیں کہ جیسے ان کے سر سے بلا ٹلی۔ ایسے لوگوں کی اولادیں عقلی و معاشی حیوانات کے علاوہ کیا بنیں گی؟

معاشرے کا عام حال یہ ہے کہ اب نہ بزرگوں کا ادب ہے، نہ چھوٹوں کے لیے شفقت۔ استاد اور شاگرد کا تعلق خراب ہو چکا ہے۔ اکثر لوگ دیوار بیچ کے پڑوسی سے کوئی تعارف نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کم ہوتی جا رہی ہے اور ایک دوسرے کے کاموں میں مدد کا جذبہ مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ کجا یہ کہ کوئی کسی کے لیے ایثار دکھائے۔

پھر زندگی میں مرکزی حیثیت دولت کو حاصل ہو گئی ہے جس کے سامنے نہ علم کی وقعت ہے، نہ ادب کا مرتبہ، اور نہ خلق و شرافت کی کوئی قیمت، نہ سیاسی کارکنوں کی بے لوث خدمات کے لیے کوئی اعتراف۔ انسانیت کی زرق برق حسین قدروں کا جمال ماند پڑ گیا ہے۔ ہر کوئی دولت کی اڑتی ہوئی سنہری اور روپہلی پریوں پر نظریں جمائے بھاگ رہا ہے۔ معیارِ زندگی کی مختلف بلند اور بلند تر چوٹیوں پر چڑھائی کا غلغلہ ہے۔ دولت ہے تو سماجی مرتبہ بھی ہے اور سیاسی وقعت بھی۔ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دولت کی ہوس اسراف و تبذیر کو ساتھ لاتی ہے۔ دولت کے ساتھ نمائشِ دولت کا شوق بڑھتا ہے۔ فیشن اور میک اپ کی وبائیں پھیلتی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی تقریبوں کے ذریعے اپنے قد کو اونچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور قرض لے کر بھی "گھر پھونک تماشہ دیکھ" کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ حصولِ دولت کے اندھے جنون نے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے فرق کا احساس ختم کر دیا ہے۔ مال چاہیے، خواہ رشوت سے ملے یا سود سے، لوٹ مار سے یا مکر و فریب سے۔ بس یہی معراجِ انسانیت ہے۔ کوئی اصول نہیں، مقصد نہیں، نصب العین

نہیں، دینی دعوت یا مشن کی کوئی مصروفیت نہیں، قومی خدمت کا کوئی پروگرام نہیں، سیاسی لحاظ سے مفید سرگرمیوں کے لیے تگ و تاز نہیں، علم و تحقیق کی دلچسپی نہیں، سائنسی میدان میں ایجاد و اختراع نہیں، دفاعی ضرورتوں کے لیے جسمانی مشقوں اور تنظیمی سرگرمیوں اور معلوماتی پروگراموں کا کوئی اہتمام نہیں، تعلیمِ بالغاں کے کام کا شوق نہیں، حتیٰ کہ گلیوں کی صفائی اور محلہ کی بہبود کے لیے کسی جگہ لوگوں میں کوئی حرکت نہیں۔

یہ ہے اس قوم کا حال جس کو وقت کے ایک بھاری چیلنج نے دو طرفوں سے گھیر رکھا ہے اور مصیبت و بلا کے لشکر تُلے کھڑے ہیں۔

سیاسی حالات پر نظر ڈالیں تو ہماری کتابِ آزادی سے جمہوریت کا جو نا تمام باب ۱۹۵۸ء سے نکال لیا گیا، نہ اس کے اوراق بحال کیے جا سکے اور نہ اُسے از سرِ نو لکھا جا سکا۔ ایک دھندلی سی اُمید لگی ہے کہ شاید ۱۹۸۵ء سے جب کہ ۵۸ء کا ہندسہ اُلٹ جائے گا، انتخابات کا دروازہ کھل جائے۔ ۲۷ سال کے اس لمبے عرصے میں جماعتوں کو اس بُری طرح کچلا گیا اور سیاسی اکابر کی اتنی کردار کُشی ہوئی کہ اب یوں لگتا ہے کہ اب سارے حدیقۂ سیاست میں کہیں کوئی ایک بھی سرو و صنوبر موجود نہیں ہے۔ ہر طرف فقط سبزۂ بیگانہ لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ کوئی ملک جب اس طرح سیاسی لیڈروں کی ٹیم سے محروم ہو جائے اور جماعتوں کے کارکن پس پچک جائیں تو عوام کی تنظیم اور تربیت کا کام تباہ ہو جاتا ہے۔ محض حکم و قانون اور بیوروکریسی اور پولیس کے ذریعے اس کمی کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ سیاسی طور پر جس قوم کے افراد تنظیموں کے بندھن سے آزاد ہو کر بکھر جائیں وہ کسی بڑے چیلنج کا مقابلہ آسانی سے نہیں کر سکتی۔

ملک گیر جماعتیں مختلف برادریوں اور صوبوں کے اندر نفوذ کر کے وحدت پیدا کرتی ہیں اور جن علاقوں یا طبقوں میں شکایات پائی جاتی ہیں، ان کے بارے میں اپنے کارکنوں کی رپورٹوں سے آگاہ ہوتی ہیں جن کو عوام کے مختلف عناصر سے قریب رہنے والے افراد تیار کرتے ہیں۔ وہ

جائز امور میں اُن کی ترجمانی اور ان کے ازالۂ شکایات اور اُن کی حقوق رسانی کے لیے آواز اُٹھا کر ملک و قوم کے مفاد کے خلاف جانے سے روک کر اُن کو اپنے ساتھ ملاتی ہیں۔

ہماری ایک سیاسی مصیبت یہ ہے کہ دستور کے معاملے میں شطرنج کے مہروں کی طرح بار بار ایک خانے سے دوسرے میں منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے ایک بار دستور ۵۶ء پر قوم متفق ہوئی۔ سو اسے دورِ ایوبی نے ختم کر کے بنیادی جمہوریت کے تصور پر مبنی دستور ۶۲ء نافذ کیا۔ پھر اگلے دور میں وہ ختم ہوا اور دستور ۷۳ء پر قوم متفق ہو گئی۔ نیا مارشل لا آیا تو پھر اگرچہ وہ دستور ابھی پوری طرح ختم نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے مرکزی تصورِ حکمرانی کو یکسر بدل کر اسلام کی ایک تعبیرِ جدید کے تحت "شوریٰ کریسی" کا ایسا نظریہ پیش کر دیا گیا جس کا مدعا مغربی جمہوریت کی خرابیوں سے ملک کو بچانا بتایا جاتا ہے مگر دوسری طرف یہ تصور آمریت کا راستہ کھولتا ہے۔ جس پر صدر ضیاء اگر نہ بھی چلیں تو بعد میں کوئی سلطان ظلِ الٰہی کے پَر لگا کر آ پہنچے گا اور اس کے لیے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔

سیاسی جماعتوں کو کالعدم کر کے یہ سمجھنا کہ اب یک جماعتی نظام کے حالات پیدا ہو گئے ہیں، شدید غلط فہمی ہے۔ لوگ یک جماعتی نظام یا لاجماعتی نظام کا فرق نہیں سمجھتے۔ اس نافہمی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کو نمونہ بنا کر کہتے ہیں کہ وہاں تو ایک ہی جماعت تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس جماعت کے ساتھ یہود و مشرکین کی جماعتیں بھی مدنی دور میں شریکِ نظمِ ریاست ہو گئیں اور خود اس جماعت کے اندر اُصولوں پر متفق رہنے کے باوجود مہاجرین و انصار کے فرق کے علاوہ مفاد و مصالح کے لحاظ سے مختلف گروپ موجود تھے۔ وہاں جو جماعت تھی اس کے لیے ایک ایک فرد کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست دعوت دے کر جمع کیا تھا۔ اور پھر ان کو دینی تعلیم و تربیت بھی دی، نظم میں بھی پرویا اور اُن کو اقامتِ دین کے نصب العین پر شعوری طور پر متحد کیا۔ آج ملت کے مختلف الخیال اور مختلف العمل افراد کو رسول اللہ کی طرح دعوت دیئے بغیر اور تربیت سے گزارے بغیر اور نظم میں پروئے بغیر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہاں ویسی ہی ایک متحد و منظم اور تربیت یافتہ

جماعت موجود ہے، جس کے بل پر یک جماعتی نظام چلایا جا سکتا ہے۔ یک جماعتی نظام متفرق افراد کے بل پر نہیں چلتا اور نہ متفرق افراد کو جماعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی مسلم قوم تو واحد قوم ہے، مگر اس واحد قوم کی واحد جماعت موجود نہیں۔ گویا یک جماعتی نظام کے علمبردار دراصل ہمیں متفرق افراد کے بل پر قائم ہونے والے لاجماعتی نظام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یک جماعتی نظام میں اگر آمریت کے ابھرنے کے مواقع ساٹھ ستر فیصد ہیں تو لاجماعتی نظام میں سو فیصد[1]!

سیاست کے چرخ گرداں کا ستم یہ ہے کہ سیاسی حقائق اور اسلام کے سیاسی اصولوں اور فارمولوں کے متعلق برسوں کی کاوشوں سے دینی حلقوں کا جو ذہن بن چکا تھا، اُسے پل میں اُدھیڑ دیا گیا ہے۔ اب ہر چیز متنازعہ فیہ اور مشتبہ بن گئی ہے — مختلف افراد — کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے — تحریر و تقریر میں ایسی ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جو پچھلے تیس سال سے نہیں کہی گئیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے پوری قوم میں عموماً اور دینی حلقوں میں خصوصاً اتنا انتشار و افتراق واقع ہو چکا ہے کہ اب لوگوں کا مل کر چلنا تو کجا، مل بیٹھنا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ وحدتِ فکر کا رشتہ ہی ٹوٹ چکا ہے۔ یہ منطقی نتیجہ ہے سیاسی خلا کے جاری رہنے اور سیاست کو قابلِ نفرت قرار دینے کا۔

خرابیٔ سیاست میں خود سیاسی لیڈروں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ حضرات اُصولوں

---

[1] نام کے یک جماعتی نظام کے پردے میں جو لاجماعتی نظام پسند کیا جا رہا ہے، اس میں فرد فرد اس طرح الگ الگ ہوگا جیسے کسی مشین کے پُرزے کھول کر رکھ دیے جائیں۔ جماعتیں اپنے نظریات اور پروگراموں پر متفق ہونے والے شہریوں کو جمع کرتی ہیں اور کئی کئی لاکھ افراد کے چند یونٹ بن جاتے ہیں، جن کی کوئی سوچی سمجھی رائے ہوتی ہے اور جسے ان کے لیڈر بیانوں اور قراردادوں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ اِس طرح آبادی میں پائے جانے والے نقطہ ہائے نگاہ اور ان میں سے ہر ایک کے حامیوں کی قوت کا اندازہ رہتا ہے۔ یہ نہ ہو تو ہر چیز مبہم ہو جاتی ہے۔

کی سیاست سے بڑھ کر "مواقع" کی سیاست پر کاربند رہے ہیں۔ اگر کسی اُصول و مقصد کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے مطابق اپنا اور اپنی جماعت کا کردار نہیں بنا سکے۔ اُنہوں نے پیروکار تو جمع کیے مگر ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا سامان نہ کر سکے، بلکہ جو درج رجسٹر ہو گیا، سو ہو گیا۔ کوئی اِدھر سے ٹوٹ کر اُدھر چلا گیا، کوئی اُدھر سے ٹوٹ کر اِدھر آ گیا، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ہے۔ نہ اِدھر کوئی خاص سانچہ ہے، نہ اُدھر کوئی ممیز ڈیزائن۔

پھر یہ لیڈر حضرات بار بار ایسے تجربے کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔ پہلے قومی اتحاد بنا جس کے خاص مقاصد تھے اور خاص مزاج۔ اس کا بندھن بغیر کسی دلیل کے توڑ دیا گیا۔ اور پھر اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر سب الگ الگ مورچوں میں بیٹھ گئے۔ پھر مارشل لا نے دبایا تو انہوں نے قومی اتحاد سے بالکل متغائر قسم کا ایک اتحاد ایم آر ڈی کے نام سے قائم کر لیا۔ اب اس اتحاد کے بندھن بھی ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اب ان اکابر کے سامنے کوئی دوسرا نقشہ تا حال نہیں ہے۔ ان حضرات نے اپنے قد کو خود چھوٹا کیا ہے اور عوام کی نگاہیں جو کبھی ان پر مرتکز تھیں، بکھر گئی ہیں۔ سوچیے کہ جہاں قائدین کا یہ کردار ہو وہاں وہ کیا کارنامے دکھا سکتے ہیں۔ کوئی شخص تو ایسا ہوتا جو کسی ایک ہی موقف پر ہر قسم کے مراعاتی حالات میں جما کھڑا رہتا۔ اب ایسے لیڈر جو نہ ثبات دکھا سکیں، نہ معقول طرز کا کوئی اتحاد قائم کر کے اُسے نبھا سکیں، ان کی خدمات سے قوم کو آزمائش کے لمحات میں کیا امداد ملے گی۔

نوبت بایں جا رسید کہ سابق معرکہ ہائے سیاست کے نامور لیڈر جو آج جگہ جگہ "مجروح" پڑے ہیں۔ وہ بھی آپس میں خیر سگالی تک کا جذبہ نہیں رکھتے۔ اور نہ سیاست کش اور جمہوریت شکن صورتِ حالات کے بارے میں کوئی متفقہ تعمیری نقطۂ نظر بنا سکتے ہیں۔ اس "بے ہمگی" نے ان کی وقعت کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔

کیا یہ فضا دفاعی نقطۂ نظر سے اچھی فضا ہے؟

اب ایک اور پہلو پر غور کیجیے۔

نوّے دن کے اندر انتخابات کرانے کا اعلان کرنے والی حکومت نے جس عملِ تطہیر کے لیے سات سال گزار دیے ہیں اُس کا سوائے سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کے اسٹیج سے گم ہو جانے کے، اور کوئی نتیجۂ خیر پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ انتخابات اگر ایک بار ملتوی ہوئے بھی تھے تو انہیں ایسے موقع پر جلد سے جلد منعقد کر لینا چاہیے تھا جب کہ موجودہ حکمران قوت کی مقبولیت و محبوبیت عروجِ کمال پہ ہوتی، تاہم اس پر بھی اللہ کا شکر کہ اب یہ اُمید دلا دی گئی ہے کہ ۱۹۸۵ء کے آغاز میں یہ مرحلہ طے ہو جائے گا۔ مگر سارے متعلقہ حقائق ابہام میں ہیں۔ نظام صدارتی ہوگا یا وزارتی؟ جھکاؤ عوامیت کی طرف ہوگا یا آمریت کی طرف؟ "شوریٰ" کیسی کیا ہے؟ کیا شوریٰ پوری طرح نمائندہ ہوگی؟ کیا اس کے فیصلے مؤثر ہوں گے؟ اس کے انتخابات کا طریقہ کیا ہوگا؟ سیاسی جماعتیں کام کر سکیں گی یا نہیں؟ دستور ۱۹۷۳ء برقرار رہے گا یا کوئی نیا تجربہ شروع ہوگا؟ اس سارے نظام میں جمہوریت کی رُوح کس حد تک ہوگی؟ مارشل لا بھی ساتھ ساتھ چلے گا یا ختم ہو جائے گا؟ یہ سارے سوالات اپنے جوابوں کی تلاش میں فضا میں بکھرے ہوتے ہیں۔ شہری گو مگو کی حالت میں ہیں۔ لوگوں کے لیے آگے کچھ سوچنا ہی ممکن نہیں ہے۔ یہ ذہنی تعطل اتنا طویل ہو گیا ہے کہ اب وبالِ جان ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے اپنی ہی قوم پر پورا اعتماد نہ ہو اور ان سے الگ تھلگ بیٹھ کر خفیہ طور پر نقشے بنائے جا رہے ہوں۔ اس طرح کی بے اعتمادی صحت مندانہ سیاسی نشوونما نہیں ہونے دیتی۔

بہتر یہ ہوتا کہ ایک سہ ماہی پیشتر سیاسی لیڈروں کی میٹنگ بلا کر پورا منصوبہ ان کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ اور ان کو رائے دہی اور تنقید کا موقع دیا جاتا۔ پھر افہام و تفہیم سے کوئی ایسی متفقہ صورت اختیار کی جاتی کہ جس کی برکت سے اربابِ حکومت اور اصحابِ سیاست کا فاصلہ کم ہو جاتا۔ اس طرح حکومت، سیاسی لیڈر اور عوام ایک لائن میں آجاتے۔ اگر یہ کام پہلے نہیں ہوا تو اب ہو جانا چاہیے۔

آزمائشی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین صورت یہی ہے۔

دفاع وہی قوم کر سکتی ہے جس میں سیاست زندہ ہو، جس کے سیاسی لیڈر نمایاں ہوں اور جس کی سیاسی جماعتیں قوت رکھتی ہوں اور جس میں ذی اختیار نمائندہ ایوان موجود ہوں۔ خطرات کے موقعوں پر جب اقتدار کے پیچھے سیاسی لیڈر اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ صف بستہ ہو کر رائے عام کو مضبوط و متحرک کرتے ہیں اور لوگوں میں ذمہ داری کا شعور و احساس پیدا کرتے ہیں تو اس طرح وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو ٹینکوں، توپوں، میزائیلوں اور ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ اہم ہوتی ہے۔

اچھی دفاعی قوت کے لیے بہت اچھے نظامِ تعلیم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک اچھا نظامِ تعلیم معلومات کے علاوہ صحیح اعتقادی، نظریاتی اور مقصدی شعور بھی دیتا ہے۔ نوجوانوں کو صداقت، دیانت، شجاعت، عدالت اور سخاوت پر مبنی اعلیٰ کردار سے آراستہ کرتا ہے، اور نظریاتی و مقصدی شعور اور اعلیٰ کردار ہی اُن میں سچا جذبۂ دفاع پیدا کرتا ہے۔ اُن میں یہ سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی ہے کہ معاملہ صرف زمین کی مٹی اور اس کی خاک کی حفاظت ہی کا نہیں ہے بلکہ ہمیں اپنے عقیدوں، نظریوں، اپنے اعلیٰ مقاصد، اپنی اخلاقی اقدار، اپنے تہذیبی اطوار، اپنی تاریخی روایات، اپنے مخصوص اجتماعی اداروں اور طہارت قلب و نظر پر مبنی ثقافتی فنون و مظاہر کی حفاظت بھی کرنی ہے، کسی فاتح کی غلامی میں صدیوں کا یہ قیمتی ورثہ برباد ہو کے رہ جائے گا۔ اور ہمارا ملّی تشخص کرچی کرچی ہو جائے گا۔

ہمارے نظامِ تعلیم نے نصابی کتب میں اس طرح کے مواد کے کچھ متفرق اجزا تو (بغیر کسی ولولہ انگیزی کے) داخل کیے ہیں، مگر ابھی اس نظام میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ متذکرہ بالا انداز پر ذہن و کردار کو تیار کر سکے۔

پھر ستم یہ کہ اس نظامِ تعلیم کے رگ و پے میں ملحدانہ تہذیب کے ایسے زہریلے نظریات سرایت کیے ہوئے ہیں، جو اسلامی طرزِ فکر کے لیے تباہ کن ہیں۔ مثلاً نظریہ ارتقاء کو تو ایسے یقین و اذعان اور بغیر کسی تنقید و اختلاف کے ابتدائی درجوں سے لے کر اعلیٰ سطحوں تک

نصابی کتابوں میں داخل کر دیا گیا ہے جیسے وہ خالص الہامی تعلیم ہو اور خدا کے پیغمبر اسے لے کر آئے ہوں۔ پھر سیاست، جمہوریت، سوشلزم، الٰہیات، منطق، اخلاقیات، عمرانیات، جدید نفسیات، تجزیہ نفس، نظریہ علم کے مروجہ تصورات اساتذۂ فرنگ سے اخذ کر کے اپنی کتابوں میں اس طرح بلا تنقید جذب کر لیے گئے ہیں کہ برسوں سے ہمارے طبقوں میں مخالفِ اسلام فکر باطلہ کی کسی شاخ کے خلاف کبھی کوئی ردِ عمل پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ ہماری ضرورت یہ ہے کہ غیر اسلامی افکار و نظریات کے باغی ہمارے ہاں ابھریں۔ اور وہ علوم کی تشکیلِ جدید اسلامی ذہن سے کریں۔

پھر مخلوط تعلیم کی بلا ہم پر مسلط ہے، حالانکہ مغرب کے جدید ترین مفکرین و مفکرات اس کے نتائجِ بد کا رونا رو رہے ہیں۔[1]

نظامِ تعلیم کی ٹیڑھ یہ بھی ہے کہ افسر کلاس اور امیر کلاس کے بچوں کے لیے الگ نظامِ تعلیم ہے جہاں انگریزی ذریعہ تعلیم ہے اور عوام کے لیے الگ۔ یک بام و دو ہوا کا منظر ہے پھر مشنری اسکولوں کی آفت مسلط ہے۔ اُردو نظامِ تعلیم کے ایوان میں پچھلے بنچوں پر کھڑی ہے

گویا تعلیمی لحاظ سے ہم ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے ذرا بھی قابل نہیں ہوئے اور اس حالِ زار میں ہمیں زمانے کے کسی خطرناک چیلنج کا کسی بھی وقت جواب دینا پڑ سکتا ہے۔ مشیت کے تحت تاریخ کے دریا کا مد و جزر کسی کا لحاظ اور انتظار نہیں کرتا۔

اگر قوت کے سب سے بڑے سرچشمے اور مزاحمتِ اغیار کے لیے سب سے اہم مورچے تعلیم گاہیں ہیں (اور یقیناً ہیں)، تو ہمارے ماہرینِ تعلیم، وزراء اور سیکرٹریوں اور اساتذہ کو تجدیدِ تعلیم کے لیے جلد از جلد بھرپور کاوش کرنی چاہیے۔

(باقی بر صفحہ ۳۸)

۱؎ ارباب مال و جاہ کی بیگمات کا ایک چھوٹا سا گروپ اپنے معاشرتی مرتبے کے زور سے مخلوط تعلیم بلکہ مخلوط ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کو پھیلانے میں سرگرمِ عمل ہے، مگر ملک کی خواتین کی ایک بھاری اکثریت اس روش کے خلاف ہے۔ مختصر اقلیت کے ذوق اور فکر و روش کو بھاری اکثریت پر مسلط کیے رکھنا اجتماعی قوت کو کم کرنا ہے۔

(بقیہ اشارات) صحافت ایک اور بڑی قوت ہے جو دفاعی ضرورت کے لیے ذہنی محاذ کو تیار کرتی ہے۔ صحافت کا وظیفہ خبر رسانی سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ حالات و واقعات کے تجزیہ کی مدد سے قوم کی معلّمانہ اور مربیانہ خدمات انجام دیتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں صحافت ایک انڈسٹری اور کاروبار بن گئی ہے، اور جو اخبارات و جرائد معلّمانہ فریضہ انجام دیا کرتے تھے وہ بھی مسابقت کی لپیٹ میں آکر فروخت اور آمدنی بڑھانے کے مروجہ حربوں کو اختیار کر چکے ہیں۔ ہمارے اخبارات نے ایک تو جنرل اسٹور کا سا پیرایہ اختیار کر لیا ہے، یعنی سیاسی افکار، واقعات و احوال کی عکاسی اور قوم اور خصوصاً غربا کے روزمرّہ مسائل و مصائب کو پیش کرنے کے ساتھ سائنسی معلومات اور علوم نجوم، طب و معالجہ، باورچی خانہ اور دسترخوان کے مسائل، کشیدہ کاری اور فیشن کی تعلیم، کھیل کود اور شو بزنس کے احوال، فقہی مسائل[1] پر بحث و مذاکرات، خواتین اور بچوں کے لیے خاص صفحات (یا ایڈیشن) ادب کے گلدستہ ہائے نوبنو، تنقید و تبصرۂ کتب کے مختلف دائروں کو زیر نگیں لے کر ہیچ رنگی اور ہفت رنگی کا ایک ایسا مزاج پیدا کر لیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن بار بار ادھر سے اُدھر مڑتے ہیں۔ پھر اہم دینی اور قومی معاملات میں دعوے اور جواب دعوے اور اُن کے ردّ، پھر اُن کی کاٹ کا ایک ایسا سلسلہ جاری رہتا ہے کہ کسی معاملے میں قارئین کی کوئی ٹھکی ہوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ ایک انتشارِ مسلسل ذہنوں کا مقدر بن جاتا ہے۔ بغیر اشخاص کی علمی یا اخلاقی سطح کا لحاظ کیے ہر قسم کی الم غلم چیزیں اس طرح لائی جاتی ہیں، گویا یہ بڑے نتائج تحقیق و کاوش ہیں۔ ہر "ہاؤ ہو" کرنے والے کے لیے میدان کھلا ہے۔

ایک وبا عورتوں کی بڑی بڑی تصاویر (پوری آراستگی و پیراستگی کی شان کے ساتھ)

---

[1] قربانی، عقیقہ اور ولیمہ سے لے کر پردے اور قصاص و دِیَت کے مسائل تک کے لیے اخباری کالموں میں دارالافتاء اور دارالمباحث کھلے ہوئے ہیں اور اخبار نویس ہر متکلّم کو مسندِ افتا پر بٹھا دیتے ہیں۔

کی ... ہے کی ہے ۔ عموماً خصوصی اوراق کے پہلے صفحے پر چار چار عورتوں کی تصاویر آتی ہیں۔ پھر ایک نیا سلسلہ "میاں بیوی آمنے سامنے" کا ایسا چلا ہے کہ جیسے کسی گھر کی دیواریں ڈھاکر اور پردے چلمنیں ہٹا کر لوگوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو اندر گھسا لایا جائے اور اُن کو دکھایا بتایا جائے کہ شوہر صاحب کے کیا اطوار ہیں اور بیگم صاحبہ کی کیا ادائیں ہیں ۔ بے پردگی کی بڑھتی ہوئی وبا کو تیز کرنے کا بڑا موثر راستہ نکالا گیا ہے ۔ پھر ایک ستم یہ ہوا کہ اب فلمی ستاروں اور ریڈیو ٹی وی کے اداکاروں اور اداکاراؤں اور موسیقاروں اور موسیقاراؤں کے متعلق تبصرے اور انٹرویو ہی نہیں ، خبروں کے صفحات میں باقاعدہ خبریں شائع ہونے لگی ہیں کہ فلاں نے شادی کر لی اور فلاں کے ہاں ولادت ہوئی اور فلاں اور فلاں میں اَن بَن ہو گئی ہے یعنی اشتہاروں کے پردے سے نکال کر اس طبقے کو خبروں کے اسٹیج پر جگہ دے دی گئی ہے ۔

چھچھوری صحافت کو سُرخی پاؤڈر لگانے کی دوڑ ہے ۔ کسی زندہ و توانا ملک کے قومی اخبارات اِس بازاری انداز سے پیش نہیں کیے جاتے ، مگر ہمارے ہاں کاروباریت کے سامنے صحافت نے ماتھا ٹیک دیا ہے ۔

ادب کا بھی حال عجب ہے ۔ قومی یا دینی بنیادوں پر کوئی مرکزی نظریہ و نصب العین نہیں ہے جو نثر نویسوں اور نظم نگاروں کے ذہنوں میں رچ بس کر ان میں کسی قدر ہم آہنگی پیدا کرے اور اپنے تہذیبی ، سیاسی اور دفاعی تقاضوں کے لیے تعمیری رجحانات دے سکے ۔ شہرت کا ایک راستہ ہے جس پر بڑے ادیبوں کے پیچھے چھوٹے ادیب بھی دوڑ رہے ہیں اور اپنی اپنی کاوشوں کو مخطوں میں لیے اُن کی رُونمائی کے لیے تلاش محفل میں ہیں ۔ ادبی کتابوں کے لیے باراتِ نشستہ کا انتظام کیا جاتا ہے اور اس میں چند ممتاز ہستیوں سے تعریفی جملے کہلوائے جاتے ہیں ۔ بیچارے اکابر اس لیے مارکیٹ کی اس مانگ کو پورا

لہ راقم نے ایک دن کے کسی اخبار میں بسا اوقات چار چار ایسی خبریں خبری صفحات میں باقاعدہ نمایاں سرخیوں کے ساتھ پڑھی ہیں ۔

کرتے ہیں کہ خود انہیں بھی تو چھوٹے بڑے ادیبوں میں سے اپنے لیے گاہک، قارئین، ناقد اور تحسین کار چاہئیں۔ یہاں تو سودا نقد انقد ہے کہ اِس ہاتھ دے اور اُس ہاتھ لے۔

اکابرین ادب کی ایک بڑی تعداد کے یہاں نظریۂ الحاد، سیکولر ذہنیت، اوپن سوسائٹی، بے پردہ معاشرت اور اشتراکی نظام کا پروپیگنڈا تو نگارشات میں رچا بسا ملتا ہے، مگر یہی بات اگر اسلام کے متعلق چاہی جائے تو اعتراض یہ ہے کہ اس طرح تو ادیب کی آزادیٔ ضمیر ماری جائے گی۔ جن مستعار مغربی نظریاتِ ادب و تنقید کی غذا سے ذہنوں کی پرورش ہوئی ہے وہ اپنے اندر اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ اپنا نظریۂ ادب و تنقید کوئی ہے ہی نہیں کہ جسے بنائے فکر و بحث اور معیارِ فیصلہ بنایا جا سکے۔

ادب و صحافت کے دو بڑے فکری سرچشموں کا گدلا پن قوم کے نوجوانوں میں اسلامی جہاد کے ذوق کو پنپنے ہی نہیں دیتا۔ اگر ہمیں کسی چیلنج کا سنجیدگی سے جواب دینا ہے تو ان فکری سرچشموں کی تطہیر کا انجام کرنا ہوگا۔

حضرات علما کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ناخوشگوارئ احوال کے بعض ایسے پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہے، جن کی ذمہ داری اس معزز طبقے پر عاید ہوتی ہے۔

یہ اہم طبقہ جس کے گراں مرتبہ ۳۳ نمائندوں نے جمع ہو کر تمام مکاتبِ فکر کی جانب سے ۱۹۵۱ء میں ۲۲ دستوری اُصول بالاتفاق پاس کیے تھے، جس کے متعدد اکابر نے مل کر ۱۹۵۴ء کے مسودۂ دستور کے متعلق متفقہ طور پر تفصیلی دستوری ترمیمات طے کی تھیں۔ جس نے عائلی قوانین کے خلافِ شریعت پہلوؤں کے خلاف یک آہنگی سے آواز اُٹھائی تھی۔ اور جس نے دَورِ ایوبی میں رویتِ ہلال تک کے مسئلے میں اجتماعی رویہ اختیار کیا تھا، اب یہ ایسے مقام پر آ گرا ہے کہ اس کے لواحقین بڑے بڑے خلافِ شریعت قوانین کے خلاف — خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، معاشرتی یا قانونی، مل بیٹھنے کے روادار نہیں

ہیں - مدت بعد قصاص و دیت[1] کے مسئلے پر چند ممتاز علماء نے اکٹھے ہو کر ایک متحدہ موقف اختیار کر کے بیان دیا ہے - ؎

پس از مدت گذار افتد بر ما کاروانے را

پچھلے چند سال سے مسجدوں اور مدرسوں میں فرقہ وارانہ معرکہ آرائی کے مورچے بن گئے ہیں، اور لاؤڈ اسپیکر توپوں اور مشین گنوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں - باہمی تکفیر و تفسیق بھی چلتی ہے، تقریروں کا ٹکراؤ بھی ہوتا ہے - پمفلٹ بازی بھی جاری ہے - نتیجہ یہ کہ تاریخی واقعات اور فقہی مسائل کے اختلاف پر مبنی گروہ بندیوں نے ایک طرف کے مسلمان اور دوسری طرف کے مسلمان میں ایسی مغائرت پیدا کر دی ہے کہ جیسی کافر و مسلم میں ہوتی ہے ان میں باہمی رشتے نہیں ہو سکتے اور ایک جگہ نماز پڑھنے کی روا داری نہیں ہے - ان گروہ بندیوں کے سالاروں نے پوری ملت کو پھاڑ کے رکھ دیا ہے - پچھلے دنوں جو سانحہ لاہور کی بادشاہی مسجد میں ہوا، اور اب جو اذیت ناک تصادم کراچی میں ہوا ہے اُس نے تمام اہلِ احساس کو ہلا کر رکھ دیا ہے - اب یہ بات عام طور پر سمجھ میں آنے لگی ہے کہ فرقوں کی یہ بڑھتی ہوئی معرکہ آرائیاں سیاست اور انتخابات کے لیے بھی خطرناک ہیں، عام ترقی کے لیے بھی مضر ہیں اور دفاع کے لیے ہلاکت انگیز ہیں -

---

[1] افسوسناک معاملہ یہ ہے کہ برسرِ عام اخباری صفحات پر علماء اس مسئلے پر متحارب ہونے سے پہلے اگر ایک روزہ یا سہ روزہ مشاورت کر لیتے اور تمام گروہوں کے نمائندہ دس بیس حضرات ایک مشترکہ موقف اختیار کر لیتے تو علماء کے وزن اور ان کی قوت میں اضافہ ہوتا - مگر ایسا اس لیے نہ ہو سکا کہ ایک طرف کچھ لوگ حکمران کے غمزوں کو پڑھ کر اپنے افکار کو ترتیب دیتے ہیں - کچھ کو خواتین کے زلف و ابرو کا لحاظ ہے جب کہ کچھ دوسرے اصحاب کو ان کے ووٹوں کی فکر بھی ہے - کچھ اور ہیں جو شہرت کے بلند تر اسٹیج کی روشنیوں کے سیلاب میں جلوہ فگن ہونا چاہتے ہیں، جیسے کہ ایک نوخیز حضرت نے ایک پرانے سکہ بند عالم سے یہ کہا کہ آپ بھی عورت کی دیت کو مرد کے برابر قرار دیں تو "واہ وا" ہو جائے گی -

پھر بات اندرونِ وطن تک ہی محدود نہیں، بلکہ تفرقہ کے یہ سوداگر دنیا کے ہر اس گوشے میں پہنچتے ہیں جہاں تارکِ وطن پاکستانی معاشی تگ و تاز کے ساتھ دین کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ ان سوداگرانِ تفرقہ کے جانے سے پہلے تمام فرقوں کے لوگ غیر مسلم معاشروں میں مل جل کر اپنے دینی اور ثقافتی زندگی کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام بھی کرتے چلے آرہے تھے۔ مگر یہ جہاں پہنچے وہاں انہوں نے اتحاد کی صفوں کو پھاڑ دیا۔ فرقے از سرِ نو بحال کر دیئے اور مسجدوں کو اکھاڑا بنا دیا۔ یہاں تک کہ متنازعہ مسجدوں پہ تالے لگ گئے اور پولیس کے پہرے بیٹھ گئے۔ ان حضرات کو اس بات پر شرم بھی نہ آئی کہ اُن کے اپنے ملک میں شدید اختلاف رکھنے والی عیسائی مشنریاں بیک وقت کام کر رہی ہیں۔ اور ان میں کبھی کوئی تصادم اور مناقشہ نہیں ہوا۔ لیکن مسلمانوں کے متفق واعظوں کا یہ شاندار کارنامہ ہے کہ انہوں نے کفار کے ممالک میں جا کر یہ تماشا دکھایا کہ مسلمان اور مسلمان دین کے نام پر لڑ رہا ہے۔

اتحاد کی بات ہو تو یہ حضرات اتحادِ ملت پر بہت شاندار وعظ بھی کہتے ہیں، مگر اپنے وعظوں ہی کے ذریعے ایسے لفظی نشتر بکھیرتے ہیں جو دلوں کو لہولہان کر دیتے ہیں بجائے اس کے کہ یہ محترم ہستیاں چیلنجوں سے گھری ہوئی قوم کو جہاد کے لیے تیار کرتیں اور عوام خصوصاً نوجوانوں کو صفِ واحد میں لا کر بنیان مرصوص بنا دیتیں، انہوں نے دشمن طاقتوں کے لیے ملی زندگی کے قلعے میں شگاف اور دراڑیں پیدا کر دی ہیں۔

ان میں ایک کثیر تعداد ایسے واعظوں کی ہے جو غیبی حقائق کی نت نئی باریکیوں اور عملی زندگی سے دور کے نکاتِ لطیف کی موشگافیوں، بے اصل قصے کہانیوں، اور بے تکی من گھڑت روایات کو زبان پر لا کر عوام کو مبہوت کرتے رہتے ہیں۔ کم سے کم میری تو بدنصیبی یہ ہے کہ میں نے متعدد ایسی مسجدوں میں جمعہ کی نمازیں پڑھتے ہوئے اور دینی تقاریب کے حلقہ وار جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے کبھی کوئی تقریر ایسی نہیں سنی جس میں مسلمانوں کی باہمی محبت، صفائی اور شائستگی، خدمتِ خلق، رزقِ حرام سے اجتناب، طرح طرح کے جرائم کے خاتمے تقریبات میں اسراف اور رسومِ بد کے ازالے اور اس طرح کے دوسرے اصلاحی موضوعات کو لیا گیا ہو۔ ملک کے اہم اضطراب انگیز مسائل کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ نت نئے اٹھتے لادینی نظریے

اور انحرافی فتنوں پر کوئی بحث نہیں ہوتی --- اور اگر کہیں کوئی جزئی تذکرہ ایسا آ بھی جائے تو وہ مؤثر دلائل سے خالی اور جذباتی زورِ بیان کی وجہ سے بے نتیجہ رہتا ہے۔ اچھی سے اچھی باتیں مضحکہ بن جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ، خصوصاً نوجوان ایسی تقریروں کو سُن کر سرے سے دینی دلچسپی ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان سارے نتائج کا حساب علماء اور ائمہ اور واعظین کو آخرت میں دینا ہوگا۔

پھر لاؤڈ اسپیکر کا وہ بے محابا اور بے رحمانہ استعمال کہ نہ محلے کے بیماروں کا لحاظ، نہ تھکے اور کمزور لوگوں کی نیند کا پاس، نہ طالب علموں کی پڑھائی کی رعایت، نہ لکھنے پڑھنے والوں کے مشاغل کی اہمیت کا احساس، --- بس آواز کا ایک طوفانی دریا ہے جو آس پاس کے گھروں میں انڈیلا جا رہا ہوتا ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ دین کا ایک مستقل ادنیٰ خادم ہونے کے باوجود مجھے جب کبھی لاؤڈ اسپیکر کی بوچھاڑ کا نشانہ بننا پڑتا ہے تو میرے اندر سخت بددلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر لاؤڈ اسپیکروں کا مقابلہ ایک مزید آفت ہے۔ ایک مسجد کے مقابل کی دوسری مسجد میں زیادہ طاقت ور لاؤڈ اسپیکر نصب کیا جائے گا۔ پھر پہلے والی مسجد میں اس کی فکر شروع ہو جائے گی کہ آواز کی جنگ میں فتح ہماری ہونی چاہیے۔ تماشا یہ ہے کہ بسا اوقات مسجد کے اندر دس بیس آدمی موجود ہوتے ہیں۔ مگر لاؤڈ اسپیکر کے شور کا وہ طوفان اُٹھ رہا ہوتا ہے کہ سننے والا گمان کرتا ہے کہ ہزاروں کی حاضری ہوگی۔ اس طرح خلقِ خدا کو خدا کا نام لے لے کر اذیت دینا کوئی نیکی نہیں ہے۔ صرف اذان کے لیے بیرونی لاؤڈ اسپیکر استعمال ہونے چاہییں۔ بقیہ تمام کاموں کے لیے مسجد کے اندر محدود آواز دینے والے لاؤڈ اسپیکر کام میں لائے جانے چاہییں۔ خدا کے گھر سے جو کام بھی کیا جائے۔ اس میں شرافت و شائستگی کے تمام پہلو ملحوظ رکھنے چاہییں، ورنہ ہر کوتاہ کاری کا حساب مذہبی عناصر کے مجموعی کھاتے میں درج ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ "جی یہ لوگ ایسے اور ایسے ہیں۔"

اس ناگزیر تجزیاتی اور تنقیدی گفتگو پر معذرت خواہی کے ساتھ ایک بار پھر ہم علماء کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ التماس کرنا چاہتے ہیں کہ براہ کرم اپنی قوم کے افکار اور کردار کی تعمیر اس طرح کیجیے کہ یہ کسی بھی آزمائش کے لمحے میں مضبوط ثابت ہو۔

معاشی طور پر جس معاشرے میں محرومیاں، ناہمواریاں، دکھ درد اور گلے شکوے پائے جاتے ہوں، وہ جارحیت کاروں کے لیے مضبوط قلعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ہاں سب سے بڑی بلائے بے درماں جاگیرداری اور وڈیرہ ازم ہے۔ دو بار "زرعی اصلاحات" کا شور ہوا، مگر کوئی مردِ کار یا گروہِ عزیمت مند ایسا نمودار نہ ہوا جو اس قوتِ غارت گر کے گڑے ہوئے پنجوں کو معاشرے کی گردن سے الگ کر سکے۔ جاگیردار اور وڈیرے ایک طرف غنڈے پال رکھتے ہیں اور جرم و جفا کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں، پھر اپنی اس تخریبی قوت کے ساتھ اپنی دولت کے زور کو ملا کر خوشامدانہ انداز سے اربابِ جاہ کو رام کرتے ہیں۔ اب رہ جاتی ہے بیوروکریسی، سو اپنے دوہرے رسوخ کے ذریعے ان کو ایسے ذاتی ملازمین میں بدل لیتے ہیں جو اُن کے اشارہ ابرو پر حکومت کے قوانین، ضوابط، مقاصد اور منصوبوں کا بھی حلیہ بگاڑتے ہیں اور عوام کو بھی ان کے سامنے کالانعام بنا دیتے ہیں۔ پھر ان جاگیردار وڈیروں کے الگ الگ جتھے بن جاتے ہیں۔ اور یہ جتھے آپس میں قوت آزمائی کرتے ہوئے زیر و زبر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جاگیرداروں اور وڈیروں کا ایک بڑا حربہ یہ بھی ہے کہ یہ آس پاس کے مزاروں اور درگاہوں کو مرکزِ عقیدت بناتے ہیں۔ اور گدی نشینوں اور مجاوروں کا خوب پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے دائرہ اثر میں علماء (خصوصاً چھوٹے چھوٹے خطیبوں اور اماموں) کو استعمال کرتے ہیں۔ اور جو پوری طرح مسخر نہ ہوں اُن کو نہ کھل کر کام کرنے کا موقع دیتے ہیں، نہ حق بات کہنے کا اذن۔ اس طرح جاگیرداریوں اور وڈیرہ ازم کی جا بجا سلطنتیں (سلطنت در سلطنت) قائم ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ لوگ ووٹوں کی منڈی کے آڑھتی بن کر بیٹھتے ہیں اور یا تو خود انتخابات میں آتے ہیں یا اپنے مہروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اور اصلاح و تعمیر چاہنے والی ہر شریف و دیانت دار قوت کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں سیاست و جمہوریت کا حلیہ جس طرح بگڑا ہے اس میں بہت بڑا حصہ جاگیرداروں اور وڈیروں کا ہے۔ سندھ کی خرابیٔ احوال کی ذمہ داری خاصی بڑی حد تک ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔ اس سیاست بگاڑ، اخلاق شکن اور خیانت آموز قوت کا زور توڑے بغیر پاکستان صلاح و فلاح سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

اب یہ امر حیرت ناک ہے کہ نفع آور منصوبوں کے لیے اسی گروہ کو مزید زمینیں دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یعنی ہم لوگ "ہروانِ پشت بمنزل" بن گئے ہیں۔

صنعت کا محاذ ہمارے ہاں مجموعی طور پر ابتدائی مرحلے میں ہے اور کمزور ہے۔ چھوٹی چھوٹی صدہا اشیاء ایسی ہیں جو آسانی سے بن سکتی ہیں مگر ہم درآمد کرتے ہیں۔ "پن" اور سوئی تک کے معاملے میں ہم دوسروں کے محتاج ہیں۔ پھر یہ مصنوعات چند برس بھی قائم نہیں رہتا، یہاں تک کہ خام اجناس کی طرح جو مصنوعات برآمد ہوتی ہیں وہ بھی پستیٔ معیار، دکھائے ہوئے نمونے سے کمتر ہونے اور جعل سازی اور ملاوٹ کی وجہ سے وجۂ شکایت بنتی ہیں۔ اور بیرونی منڈیوں کے دروازے ہم پر نہیں کھل سکتے۔ درآمدی پہلو سے دیکھیں تو میک اپ کے سامان سے لے کر تعیشاتی مشینوں اور آرائشی سامانوں اور ٹیپوں، تصویروں اور فلموں تک فضولیات کا ایک سیلاب چلا آرہا ہے۔ جو ہمارے زرِ مبادلہ کی فصل کو مسلسل تباہ کرتا رہتا ہے۔ مزید ستم یہ کہ خلافِ قانون اسمگلنگ کے کھلے اڈے بھی قائم ہیں اور خفیہ طور پر بھی پارچات، الیکٹرانک کی مصنوعات اور گاڑیوں کے سپیئر پارٹس کئی کئی اطراف سے اسمگل ہو رہے ہیں —— اور عین قانون کے سایے میں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نگاہوں کے سامنے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں درآمدی برآمدی تجارت میں اگر خسارہ ہو رہا ہو تو پیاز اور آلو برآمد کر کے اُسے کہاں تک پورا کیا جا سکتا ہے۔

سُودی معیشت کا دریا زور شور سے بہہ رہا ہے، اس کے اندر ایک غیر سُودی دھارا بھی رواں ہو گیا ہے۔ آخر یہ کہاں تک غیر سودی ہو سکتا ہے۔ ایک طرف سُود جاری ہے، دوسری طرف زکوٰۃ کا سلسلہ بھی چل نکلا ہے۔ یعنی ہمارے ہاں سرمایہ و دولت کے نظام میں اجتماعِ ضدّین کا دلچسپ تماشہ سامنے ہے۔

اِدھر ٹیکسوں کا بڑھتا ہوا بوجھ درمیانہ تنخواہ دار طبقے کی کمر توڑے دے رہا ہے[1]۔

---

[1] اسی بجٹ کے سلسلے میں پٹرول ڈیزل کی قیمتوں کے اضافے کو عالمی تیل منڈی کے نرخوں کے تقابل میں دیکھیے، پھر ذرا یہ یاد کیجیے کہ پانی کے نرخ بجائے تدریجاً بڑھانے کے (باقی برصفحہ آئندہ)

اِس سلسلے میں کبھی کسی سے معاشرتی حالات کا سروے کر کے نہیں دیکھا کہ اوسطاً کتنا کفاتی بوجھ ہر تنخواہ دار یا دکاندار کے سر ہے اور اس بوجھ کے ساتھ وہ لوگ بڑھتا ہوا ٹیکس ادا کر کے کن مشکلوں سے دوچار ہیں، جو اس شرافت کش دور میں دینی و اخلاقی قدروں پر قائم ہیں۔ عالمِ بالا کے ماہرینِ حسابیات دفتروں میں بیٹھ کر بغیر سماجی حالات کو جانے اس طرح ٹیکس لگاتے چلے جاتے ہیں گویا اس سرزمین پر کچھ بے زبان لدّو مویشی بستے ہیں کہ اُن پر نت نیا بوجھ ڈالتے چلے جاؤ یہاں تک کہ وہ فاقہ کشی کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر دم توڑ دیں۔ یہ رویّہ تو کا ہوتا ہے کسی حکومت کے کارپردازوں کا نہیں جو ساری آبادی کے لیے مائی باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عہدہ داروں اور افسروں کے طبقۂ اعلیٰ کی بھاری تنخواہیں اور وسیع مراعات (جن میں غیر ملکی سفر کرنا اور اعلیٰ پیمانے کے آپریشنوں اور علاجوں سے استفادہ کرنا بھی شامل ہے) اور ان کے ساتھ ملکی وسائل سے ناجائز استفادہ کی صورتیں نیز رشوت کی کمائیاں مل جل کر معاشی اُلجھن کو اور پیچیدہ کر دیتی ہیں۔

ایک مسئلہ غیر ممالک میں جانے والے پاکستانیوں کے کمائے ہوئے زرمبادلہ کا ہے۔ جہاں یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ اس ذریعۂ آمدنی نے ہمارے نظامِ مالیات کو بڑا سہارا دے رکھا ہے، وہاں ایک پہلو سامانِ اضطراب بھی ہے۔ بیرونی آمدنی کا ایک بڑا حصّہ تفریح و تعیش کے جدید مہنگے سامانوں اور قیمتی پارچات کی نذر ہوتا رہتا ہے۔ اور دوسرا بڑا حصّہ زمینیں اور پلاٹ خریدنے اور مکان بنانے پر خرچ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں باہر جا کر کام کرنے والوں کے گھروں اور خاندانوں کا معیارِ زندگی بلحاظ اوسط

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ایک بار دو گنے کیے، پھر دوسری بار دُگنے کیے گئے اور پھر تیسری بار دُگنے کر دیئے۔ بجلی کے نرخوں کا بھی سال وار گوشوارہ غور سے ملاحظہ کیجیے۔ آخر یہ کیسی رعایا پروری ہے۔ حکومت کو وہ انداز نہیں سجتے جو اجارہ دارانہ حیثیت کے بل پر نفع پرست صناع یا تاجر اختیار کرتے ہیں۔

تقریباً ۱ : ۷ کی نسبت سے زیادہ بلند ہے۔ ان گھروں نے مارکیٹ میں بڑے پیمانے پر مہنگی سے مہنگی خریداری کر کے قیمتوں کو بلند تر کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس طرح متوسط سطح کے ملازمت پیشہ شرفا کے لیے زندگی کی مسابقت جان لیوا ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ اب شادیوں کے لیے ایک مؤثر کوالیفکیشن یہ ہو گئی ہے کہ "لڑکا باہر کام کرتا ہے"۔ عورتوں کی مجلسوں میں نگاہ اس بات پر رہتی ہے کہ خاتون نے اور اس کے بچوں نے باہر کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔

اس بیرونی آمدنی کو اگر شروع سے انضباط میں لیا جاتا اور اس کا کچھ فیصد حصہ کسی قومی فنڈ کے ذریعے صنعت و تجارت کے ایسے کاموں میں لگایا جاتا کہ باہر جانے والوں کو جب واپس آنا پڑتا[1] تو انہیں یہاں کوئی مناسب کام مل جاتا تو یہ بصیرت مندی اپنی برکات دکھاتی۔ مگر اب جس طرح "کھوہ کی مٹی کھوہ" لگتی رہتی ہے، اس کا نتیجہ جلدی پریشانی کا سبب بنے گا۔

اُوپر سے غیر ملکی قرضے ہیں جن کی ہم پر اس طرح نہیں چڑھتی جا رہی ہیں جیسے صحرا میں بگولوں کے ساتھ اُڑتی ریت کی تہیں ٹیلوں اور سنگپاروں پر چڑھتی رہتی ہیں۔ ہم قرض لیتے ہیں، پھر قرض کا سود ادا کرنے کے لیے مزید قرض لیتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے۔

ہمارے معاشی و مالیاتی نظام کی کمزوری کا ایک سبب کسی نمائندہ ایوان میں بجٹ کا پاس نہ ہونا ہوتا ہے۔ اگر کسی ذمہ دار انتظامیہ کے وزیر خزانہ کا بنایا ہوا بجٹ ہوتا اور وہ باقاعدہ کسی نمائندہ ایوان میں زیر بحث آتا تو اس کے پُراسرار پہلو نمایاں ہو جاتے اور اس کے کمزور پہلوؤں کی درستی ممکن ہوتی۔ اب تو بجٹ ایک شخص کا بنایا ہوا ہوتا ہے جس

---

[1] یہ واپسی اب مشرق وسطیٰ سے شروع ہو گئی ہے کیونکہ ایران عراق جنگ نے خلیجی ریاستوں کے اقتصادی حالات پر بُرا اثر ڈال دیا ہے۔ کسی بھی دوسرے مغربی ملک کے حالات اچانک ایسا رُخ اختیار کر سکتے ہیں کہ وہاں سے ہمارے کارکنوں کو واپس آنا پڑے۔ اگر ان کے لیے کوئی انتظام نہ ہوا تو بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد ملک کے حالات پر اثرات ڈالے گی۔

کی جھلک مارشل لا اور بیوروکریسی کے چند افراد کی مجلس کو دکھائی جاتی ہے، اور پھر اس پر مہرِ نفاذ لگ جاتی ہے۔ نہ اخباروں میں بحثیں، نہ اسٹیجوں سے کوئی ردّ و قدح۔ اور تو اور حکومت کی اپنی مرتب کردہ مجلسِ شوریٰ کے سامنے بھی وہ تبرکاً پیش ہوتا ہے، اس میں یہ مصنوعی ایوان بھی کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔

اِن حالات میں ہمارے ہاں بے روزگاری بھی ہے اور کفالتی سطح سے بہت نیچے کی آمدنیوں کی وجہ سے غربت کی شدید اذیتیں بھی ہیں۔ غور فرمائیے کہ متوسط طبقے کے نچلے حصّے سے تعلق رکھنے والے جن افراد کو اپنے کنبے کی کفالت کے لیے دو ہزار سے نیچے کی آمدنی ہوتی ہے وہ کرایۂ مکان ادا کرنے کے بعد چار پانچ افراد کی ضروریات کیسے پوری کرتے ہوں گے۔ اور حال یہ ہے کہ اس سطح کے بے شمار افراد کی آمدنیاں ہزار بارہ سو سے زائد نہیں۔ اب جن کی آمدنیاں ہزار سے بھی کم ہوں، اُن کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اور پھر غریب طبقہ کو لیجیے جسے ۲، ۳ یا ۴ سو ماہانہ ملتا ہے۔ اس معاشی دباؤ نے رشوت اور خیانت کے روگ کو تیزی سے بڑھانے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا ہے۔ ایسی ہی محرومیوں نے سندھ اور دوسرے علاقوں میں بڑی تلخیاں پیدا کر دی ہیں۔

اِن حالات میں کسی جارحیت کا مقابلہ کرنا پڑ جائے تو بڑی سنگین آزمائش ہوگی۔ قوم کے حکمرانوں، سیاسی اور دینی قائدین، ماہرینِ معاشیات و مالیات کو ایک تیز رفتار نقشۂ کار کے تحت چند ایسے موثر انقلابی اقدامات کرنے چاہئیں کہ غریبی اور محرومی کے دُکھ سے لوگ نجات پا سکیں اور طبقاتی ناہمواریوں کا خاتمہ ہو جائے۔

قوتِ دفاع پر اثر انداز ہونے والا ایک عامل کسی قوم کا ثقافتی اسلوب بھی ہے۔ اگر یہ اسلوب پہلے سے جنسیت انگیز، فحش، تعیش پسندانہ ہو تو وہ عوام کے ذہنوں کو اعلیٰ مقاصد کے لیے قربانیاں دینے سے دُور ہٹاتا ہے۔ پھر خصوصاً اس صورت میں جب کہ ثقافتی اسلوب بنیادی عقاید و تصورات اور اخلاقی اقدار سے ٹکراتا ہو تو یہ تضاد بڑا خطرناک روگ ثابت

ہوتا ہے۔

اور ساری باتیں الگ رکھ کر سوچیے کہ آیا ہماری ثقافت عین مین وہی ہے جو بھارت، اسرائیل، روس اور امریکہ کی ہے، کیا ہمارے ثقافتی نشو و ارتقاء کا رنگ وہی ہوگا جو کسی ملحد اور مادہ پرست سوسائٹی کا ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دینی حدود و قیود ہوں، نہ صنفین کے اختلاطِ عام سے پرہیز، نہ لہو و لعب سے اجتناب، نہ اسراف و تبذیر پر بندش، نہ روحِ حیا کے تحفظ کے لیے نظامِ حجاب اور نہ خدا پرستی اور آخرت جوابدہی کا کوئی احساس کارفرما ہو؟

ہمارے ہاں ثقافتی نشو و نما غلام محمد کے دور سے لے کر ایوب خانی دور تک اور یحییٰ خاں کے زمانہ اقتدار سے لے کر پیپلز پارٹی کے عہد تک (بلکہ اس کے بعد بھی) ٹھیک انہی خطوط پر ہوتا چلا آ رہا ہے جو مغرب کی لادین تہذیب کے مقرر کردہ ہیں۔ اور جن کو سامراجی طاقتیں مسلمان معاشروں میں اس مقصد سے پھیلانے پر تلی ہوئی ہیں کہ اس رنگین و دلفریب راستے سے اسلام کو ایک فعال تاریخی قوت بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ صیادانِ مغرب کے اقبال کا ایسا جادو ہم پر طاری ہے کہ ہم ان کے پھینکے ہوئے جال کے حلقے اپنی ہی منقاروں سے کس رہے ہیں۔ ہمیں لفظِ ترقی کے جو معانی دوسروں نے طے کر کے دیئے ہیں ان میں چند دوسری چیزوں کے علاوہ مخالفِ اسلام ثقافت کا فروغ بھی شامل ہے۔ تہذیبِ جدید کے لغت کے خلاف بغاوت تو کجا، ذرا سی جرأتِ اختلاف بھی نہیں ہے کہ کچھ تو فرق و امتیاز رہ جائے۔ اس حالت کا نام ثقافتی غلامی ہے اور یہ غلامی فکر و کردار دونوں کو کمزور کرتی ہے۔ قرآن و حدیث کچھ اور کہتے ہیں اور ثقافت کسی اور طرف لے جا رہی ہے۔

اُن گذرے ہوئے واقعات کو تو چھوڑیئے کہ بعض قومی اکابر نے شادیوں کی تقاریب کے موقع پر شراب و رباب کے ہنگامے برپا کیے اور ان سے ایسے لوگ بھی حظ اندوز ہوئے جن کا منصب ایسی حرکات کی روک تھام کرنا ہے۔ تازہ احوال یہ ہیں کہ "جمعیت" کا گلا گھونٹنے کے بعد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ڈرامیٹک کلب اور میوزک سوسائٹیاں قائم ہو گئی ہیں، جن کے اسٹیجوں پر ثقافت نے ناچنا گانا شروع کر دیا ہے۔

انہی دنوں اسلام آباد میں، جہاں نفاذ اسلام کی علمبردار شخصیت مسند صدارت پر متمکن ہے، ٹیبل ٹینس چیمپئن شپ کا انعقاد ہوا۔ جس میں باہر اور اندر کی عورتوں کی ٹیموں نے حصہ لیا۔ باہر والیاں تو ترقی کی راہ پر کافی آگے جا چکی ہیں اس لیے انہوں نے نیکروں میں جلوہ افشانی اور اعضا جنبانی کے مناظر دکھا کر پاکستانی عورتوں کی رہنمائی کی۔ خود پاکستانی عورتیں ابھی تو قمیص شلوار کے ساتھ شریک ہوئیں، مگر آخر بدن کی بڑھتی ہوئی قوت لباسوں کو تار تار کر کے رہے گی۔ اِن کھیلوں کے مناظر ٹیلی وژن پر دل کھول کر دکھائے گئے، تاکہ پورے پاکستان کے مرد و زن، طالبان و طالبات علم اور بچے بچیاں "ثواب" سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان مناظر کے خلاف ایمانی و اخلاقی احساس رکھنے والوں نے احتجاجی مراسلے بھی لکھے، مگر ترقی کا طوفان احتجاجوں سے کہاں رُکتا ہے۔ یہاں وزیروں سے لے کر بیوروکریٹس تک کوئی بھی نہیں جو یہ آواز اُٹھا سکتا کہ ہم اُمتِ محمدیہ کو ایسے مظاہروں سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ اکابر کے آگے آگے ماڈرن خواتین، پیچھے لادینیت پسند اور اشتراکی عناصر جو نفاذِ شریعت کے اعلانوں اور بیانوں ہی پر سیخ پا ہیں ـــــ ایسے نقشۂ جنگ کے ہوتے ہوئے تنہا صدر پاکستان کی مشکل ظاہر ہے۔

چند روز پہلے کی خبر ہے کہ گوجرانوالہ میں بہت بڑا ثقافتی مرکز کھولا جا رہا ہے جس میں مردوں عورتوں کو ایکٹنگ کی تربیت دی جائے گی، جس میں رقص و سرود تو شامل ہونا ہی ہے۔ اس سنٹر میں رنگا رنگ تقاریب اور ڈرامے ہوا کریں گے۔ اُدھر اُدھر نفاذ شریعت اپنی جگہ جاری رہے گا۔

پنجاب کی صوبائی مجلس شوریٰ کونسل میں قریباً ایک ہفتہ پہلے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے قبل ایجنڈے (سوالات کے جوابات) سے ہٹ کر تنویر گلشن مرزا نے بطور خاص کچھ کہنے کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے نہایت دکھ اور کرب کے ساتھ یہ شکایت کی کہ رات ڈرامے کے نام سے جو کچھ دکھایا گیا ہے اُس کو بھانڈپن کہنے سے بھی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس پروگرام کو فضول اور لچر قرار دیا ہے۔ معلوم رہے کہ یہ پروگرام سرکاری انتظام سے دکھایا گیا تھا۔ اس کے لچرپن کے خلاف متذکرہ حساس خاتون آواز اُٹھائے بغیر نہ رہ سکیں

لیکن ان کی تقریر کے وقت سناٹا تو چھایا رہا مگر کسی نے نہ کوئی وضاحت کی، نہ معذرت۔

کیا کوئی قوت نوٹس لینے والی ہے جو معلوم کرے کہ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا، اور کس کے ایما پر ہوا؟

تعلیم گاہوں میں نوعمر اور نوجوان طالبات کے مختلف قسم کے شو ہوتے ہیں۔ ان کے لیے گویا لازمی ہے کہ کوئی مرد وزیر یا افسر اپنا سایۂ شفقت فراہم کرے۔ آخر کیوں؟ اس روش کی سند جواز کس شریعت سے لی گئی ہے؟

ویگنوں (اور بسوں اور ٹرکوں) میں موسیقی کے کیسٹ ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ ڈرائیور اکثر آواز بہت اونچی رکھتے ہیں۔ اور چھ چھ گھنٹے کے سفر میں یہ عذاب مسافروں خصوصاً خواتین کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ مسافر ایسے ہوتے ہیں جو سرے سے موسیقی کو حرام سمجھتے ہیں، کچھ وہ جو نشر ہونے والے واہیات فلمی گانوں کی فحش پن سے اذیت اٹھاتے ہیں۔ بقیہ بھی شورِ مسلسل کی وجہ سے بدمزہ ہوتے ہیں۔ اور خواتین اور نوجوان لڑکیاں دل ہی دل میں کٹ رہی ہوتی ہیں۔ مگر کون ہے جو بندگانِ خدا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

قانون بھی موجود ہے، قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ان کے کارکن بھی، مگر بسوں اور ویگنوں کے اندر اُمنڈنے والے اس طوفانِ ثقافت کو آج تک کوئی نہیں روک سکا، حتیٰ کہ مارشل لا بھی دم بخود ہے۔ کیا کوئی ہے جو اس چیلنج کا سامنا کرے؟

انتخابات کے حوالے سے شناختی کارڈوں پر عورتوں کی تصویر کو لازم قرار دے کر گویا ہر پردہ نشین عورت کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اگر ملک کے سیاسی دروبست میں ووٹ کے ذریعے حصہ لینا چاہے تو اپنا چہرہ نہ صرف فوٹو گرافر کے سامنے کھولے بلکہ پریذائیڈنگ آفیسر، پولنگ آفیسر اور پولنگ ایجنٹس کے سامنے بھی چہرہ نمائی کرے تاکہ اس کی صورت کو تصویر سے ملا کر دیکھا جا سکے، جہاں تک اس معاملے میں دلائل کا تعلق ہے، ہم گذشتہ شمارے میں تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ مگر بے بسی ہے کہ دلیل کو قوت کے سامنے وزن حاصل نہیں ہے۔

وڈیو کیسٹس کے متعلق بارہا اخبارات میں مراسلات اور اداریے نوٹ آتے رہے ہیں اس وقت میرے سامنے اس مذاکرے کی روداد کا خلاصہ ہے، جو ایوانِ وقت کراچی کے

زیر اہتمام فلمی شخصیتوں کے درمیان ہوا - اور جس کی روئیداد نوائے وقت لاہور نے مورخہ ۳۱ اکتوبر کی اشاعت میں صفحہ نمبر ۵ کے ابتدائی تین کالموں میں چھاپی ہے۔

تذکرے میں کہا گیا ہے کہ "نئی نسل کو گمراہ کرنے والی مخرب اخلاق بھارتی فحش انگریزی فلموں کی عام نمائش کی روک تھام کی جائے"۔ ڈاکٹر بشیر احمد جھمرہ نے "ملک میں فحاشی کی روک تھام اور نئی نسل میں اخلاقی بے راہ روی پھیلانے والی وڈیو کیسٹ کے خلاف ہر مہم میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا"۔ پاکستان ڈسٹری بیوٹرز ایسوسی ایشن کے صدر ستیش چندر آنند نے کہا کہ "وی سی آر کے کمرشل لائسنس کی آڑ میں جھونپڑیوں اور قہوہ خانوں میں غیر قانونی سینما گھر قائم ہو گئے ہیں"۔ حاجی محمد حنیف نے کہا کہ "گھر گھر فحاشی پھیلائی جا رہی ہے"۔ عبدالباسط (یہ نام غلط چھپا ہوا ہے، معلوم نہیں صحیح کیا ہے!) نے کہا کہ "شہر میں چلنے والی وڈیو کی بیشتر دکانیں پولیس والوں کو بھتہ دیتی ہیں" لیاقت علی نے کہا کہ "ٹیکس ادا کرنے والوں کے لیے سنسر شپ کے سخت قوانین ہیں، جب کہ وڈیو پر غیر قانونی طریقے سے فلموں کا کاروبار کرنے والے ہر قانون سے بالاتر ہیں"۔

وڈیو کیسٹوں پر میری بالواسطہ معلومات کے مطابق ایسی منحوس بلیو فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں جن کے مناظر دیکھنے والوں کے ذہن میں گندے خیالوں اور جذبوں کی ایسی میخیں گڑ جاتی ہیں جو اُن کو طہارتِ فکر و نظر سے محروم کر دیتی ہیں۔

اِدھر ٹیلی وژن پر جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں وہ بھی گھروں کے اندر نہایت بُرے اثرات ڈالتی ہیں۔ ٹیلی وژن کے اپنے پروگراموں میں بھی بہت سی چیزیں سخت قابلِ اعتراض ہوتی ہیں۔ اشتہارات کے پردے میں تو جان بوجھ کر لغویات کو اُبھارا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن سے اعلان کرنے والیوں، خبریں سنانے والیوں کو تو صدارتی حکم نے آنچل اوڑھوا دیئے (اگرچہ سر کے سامنے کا حصہ ابھی تک باغی ہے) مگر ڈراموں میں آنے والی عورتوں کو پورا استثنیٰ حاصل ہے۔ پھر کتنے ہی معمول کے متوسط پروگرام ہیں جن میں مزامیر کی آوازیں

لہ میرے خیال میں ایسی فلموں کو پاس رکھنا اور اُن کی خرید و فروخت کرنا بھی ممنوع ہونا چاہیے۔

خوش کہ بہت سے ایسے لوگوں کو مستقلاً ٹیلی وژن سے بچے رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جو چنگ و رباب اور طبلہ و ستار کی آوازوں کو اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے۔ حالانکہ موسیقی اور مزامیر کے پروگرام الگ رکھے جا سکتے ہیں، جنہیں جو نہ سننا چاہے وہ نہ سنے۔

السن ثقافتی نشوونما کو ایک طرف راجہ ظفرالحق بہتری کے رخ پر ڈالنے کی کوشش رہتے ہیں اور دوسری طرف ویمن ڈویژن کی سربراہ سلیمہ احمد رستی کو دوسری طرف کھینچتی ہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں فرمایا کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ ملاؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ آخر عورت تو روحِ ثقافت ٹھہری۔ اس کا اثر تو جادو گرانہ ہوتا ہے: سوال یہ ہے کہ کن اسباب کے تحت نفاذِ شریعت اور احیائے اسلام کے دوران میں ایسے لوگوں کو کارپردازوں میں شامل کیا جائے جن کا سمتِ اقدام دوسری طرف ہو۔

کاشکہ اب مشکل حالات کو سامنے دیکھ کر اور خدا کی کسی اچانک گرفت سے ڈر کر ثقافتی سفر کا رُخ درست کر لیا جائے۔

احیائے اسلام یا نفاذِ شریعت ایسا مبارک کام ہے جو گئے گذرے مسلمانوں میں بھی زندگی کی نئی رَو دوڑا دیتا ہے۔ ابھی تازہ واقعہ ہے کہ مغربی سوڈان جو تین چار سال سے قحط اور خشک سالی کا شکار ہے اور اس وجہ سے اکابر حکومت اُدھر کا دورہ کرنے کی بھی جرأت نہیں کرتے، اچانک صدر نمیری جو اس وقت نفاذِ شریعت کی مؤثر تیز رفتار مہم چلا رہے ہیں۔ وہاں دورے کے لیے جا پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے اُن سے کہا کہ آپ اسلام کو جاری کریں، ہم یہ فقر و فاقہ صبر و شکر سے بھگت لیں گے۔ نفاذِ اسلام سے تو ایسے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور یہی جذبات دفاعی قوت کو بڑھا دیتے ہیں۔

غلبہ اسلام اور نفاذِ شریعت کے لیے جو عزم ہمارے یہاں ظاہر کیا گیا ہے اور اس کے زیر اثر بعض اقدامات بھی ہوئے ہیں، ہزار بار مبارک! مگر غلبۂ اسلام اور نفاذ شریعت کے لیے چند اصولی خطوطِ کار ہیں، جن کو اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو افکار پراگندہ ہونے لگتے ہیں اور اعمال متضاد

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ اسلام کے چند منفرق اجزا کو ایک ایک کر کے وقتاً فوقتاً نافذ کرنے کا اعلان کرنے کے بجائے جامع منصوبہ بندی کر کے ہر شعبہ کا رکے لیے ترجیحات اور مراحل طے کیے جانے چاہئیں۔ اور پھر سارا کام تین یا پانچ سالہ منصوبے کے مطابق مقررہ وقت میں مکمل کر دینا چاہیے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کسی بھی اسلامی قانون یا قاعدہ امر و نہی کو نافذ کرنے سے پہلے ایسے ماہرینِ علومِ اسلامی و علمائے قانونِ شریعت کی مناسب تعداد کے ذریعے متعین و مدون کر دیا جائے جن کے علم اور کردار پر ان کی سابق خدمات کی بنا پر عوام میں بھروسہ پایا جاتا ہو۔ قربِ اہلِ جاہ کے نئے نئے طالبوں، شہرت کے دلدادوں یا مفاد کے حریصوں کو اس طرف کا راستہ نہیں ملنا چاہیے۔

یہ طریقہ بھی عوام کو شرحِ صدر سے محروم کر دیتا ہے کہ پہلے ایک وقیع ادارہ بنایا جائے، پھر اس کی کوئی بات پسند نہ آئے یا اس سے کوئی مطلوبہ رائے حاصل نہ کی جاسکے تو مقابل میں ایک دوسرا انتظام تشکیل دے لیا جائے۔ پھر ضرورت ہو تو تیسرا اور چوتھا۔ یہاں تک کہ پسند کا نقطۂ نظر مل جائے یا ملکی ادارات کا توڑ کرنے کے لیے غیر ملکی شخصیتوں اور اداروں سے استفادہ کیا جائے یا کبھی سربراہانِ ادارات کی تبدیلی کا سہارا لیا جائے۔ ان حالات میں یک سوئی سے گامزنی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ سفر منحنی خطوط میں ہوتا ہے، اور اہلِ علم میں بحثا بحثی اور عوام میں انتشار پھیل جاتا ہے۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم ایسی حالت میں نافذ نہ کرنا چاہیے جب کہ اس سے ٹکرانے والا ایک حکم موجود ہو۔ مثلاً نکاح اور زنا دونوں کو ساتھ ساتھ نہیں چلایا جاسکتا۔ سود اور زکوٰۃ متوازی طور پر جاری نہیں رہ سکتے۔ پردے کے اسلامی تصورات اور مغرب کا تصورِ ترقی نسواں اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ ایسے تضاد اگر پیدا کر دیے جائیں تو نفاذِ شریعت کا کوئی اقدام ایک مذاق بن کر رہ جائے گا اور اس کی خیر و خوبی کالعدم ہوجائے گی۔

چوتھی ضروری بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے کارپردازوں کی ایک ایسی مضبوط ٹیم (صحیح آدمی)

موجود ہونی چاہیے جس کے تمام افراد سچے دل سے اسلام کے محب، وفادار اور اس کے اجرا و نفاذ کے لیے بے تاب ہوں۔ خود ان میں اگر تزلزل یا پیچیدگی موجود ہو تو نتائج اطمینان بخش نہیں ہو سکتے۔

مردانِ کار ہی کے سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ تمام اہم سرکاری محکموں اور شعبہ ہائے کار پر صحیح الایمان اور صحیح الفکر افراد فائز کیے جائیں۔ جہاں کہیں کوئی الحاد پسند، کوئی اشتراکی الفکر، کوئی حامیٔ لادینیت، کوئی قادیانی، کوئی مغرب پرست، کوئی مریضِ علاقائیت بیٹھا ہو، اُسے راستے سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا جائے۔ بدقسمتی سے اس پہلو سے حالات کبھی سازگار نہ تھے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا، خرابیٔ احوال بڑھتی گئی۔ چوروں سے پہرہ داری کا کام لینے کا تجربہ حسب دلخواہ نتائج نہیں دکھا سکتا۔ علی الخصوص ایسے لوگ جو احکامِ نفاذِ شریعت کا مذاق اُڑانے والے ہوں، جو اس پورے کام کو ناپسندیدہ اور قدامت پسندانہ سمجھتے ہوں، جو نظریاتی و اعتقادی طور پر اس کے مخالف ہوں، ان کی طرف سے جب کبھی کوئی مزاحمانہ قول یا فعل سامنے آئے تو انہیں فوراً ضابطے کے شکنجے میں کس کر نمونۂ عبرت بنا دینا چاہیے۔

پانچویں ضرورت یہ کہ اگر نفاذِ شریعت کے سلسلے میں کسی حکم پر عمل درآمد نہ ہو رہا ہو اور سرکاری ملازمین یا عوام میں سرد مہری پائی جائے تو اوّلاً متعلقہ افسران سے جواب طلبی کی جائے، بعدہٗ اگر ضرورت ہو تو تحقیقاتی کارروائی کر کے معلوم کیا جائے کہ پانی کہاں مرتا ہے۔

چھٹی ضرورت یہ ہے کہ ایسی عوامی جماعتیں یا تنظیمیں ہونی چاہئیں جو اُوپر کے احکام کو عوام تک دلائل کے ساتھ ترغیبی انداز سے پہنچائیں اور ان میں فرداً فرداً بھی اور محلے محلے، بستی بستی میں بھی اصلاح پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسری طرف ان کی یہ ذمہ داری از خود ہو گی کہ وہ اُوپر والوں کو آگاہ کریں کہ کون کہاں مزاحمت کر رہا ہے یا منفی انداز کے اثرات ڈال رہا ہے، یا اپنے فرض سے دانستہ غفلت برت رہا ہے، نیز خود شہریوں کو کسی معاملے میں کیا شکایات، اعتراضات یا تکالیف ہیں۔

ساتویں ضرورت یہ ہے کہ جمہوری ادارات موجود ہوں، اُوپر وفاقی پارلیمنٹ بیٹھی ہو

اور وہ اسلامی نظریاتی کونسل (یا ایسے کسی بھی ادارے) کے مسودہ ہائے قانون یا اس کے قانونی خاکوں کے مطابق مسودے تیار کرکے انہیں پاس کرے اور پھر ان کے نفاذ کی کڑی نگرانی بھی کرے۔ ایسی جمہوری فضا کے بغیر محض مارشل لا کے بل پر نافذ شدہ قوانین و احکام زیادہ عرصہ تک کے لیے وقعت حاصل نہیں کر سکتے۔

موجودہ صورت کے بجائے اگر اس خاکے کے مطابق کام کیا جائے تو عوام میں ایک نیا شعور ابھرے گا، اپنے جداگانہ تشخص کا احساس پیدا ہوگا۔ پاکستان کی اصل معنویت ان کی سمجھ میں آئے گی۔ اور اسلامی زندگی کی برکات ان کو نقد ملیں گی۔ حالات کی یہ تبدیلی ان میں تحفظ پاکستان کا نیا ولولہ پیدا کرے گی اور وہ اس سرزمین کی حفاظت محض وطن ہونے کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ اس داعیے سے کریں گے کہ اس سرزمین پر اسلام جلوہ گر ہو رہا ہے اور یہ وطن خدا اور رسولؐ کی شریعت کے لیے وقف ہے۔

زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تحفّظ پاکستان کی حقیقی قوت عوام میں پیدا کرنے کے لیے یہ تھیں وہ ضروری گذارشات جو عرض کر دی گئیں۔ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے اور جو جو باتیں درست معلوم ہوں اُن کو قبول کیجیے۔

خدا ہم سب کو راہ ہدایت پر چلائے۔ ہمیں اتحاد دے، جذبہ اخوت دے، ولولۂ جہاد دے اور تحفّظ پاکستان کے لیے عزیمت و صلاحیت دے۔

خدا سے ہم عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ یا رب! ہماری کوتاہ کاریوں اور بدعملیوں کی وجہ سے ہمیں گرفت میں نہ لیجیے اور کسی آزمائش میں نہ ڈالیے۔ جو دشمن قوتیں ہمارے اردگرد ہتھیار لیے کھڑی غرّا رہی ہیں اُن کو پیش دستی کی توفیق نہ دیجیے۔

اے احکم الحاکمین! اگر کوئی جارحیت پسند اور ظلم کیش قوت ہمارے خلاف اقدامِ بد کرے تو ہمیں اس کے گلے توڑ دینے کے قابل بنا دیجیے۔ آمین۔